قرآن مجید کیا ہے؟

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ
(۱)

کیا قرآن مجید اللہ جل وعلیٰ کا ازلی وابدی کلام ہے اور آسمانی کتاب جو جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ پر اتاری گئی ہے؟

یا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اخلاقی، روحانی اور مذہبی تجربات ہیں اور ایک آواز ہے جو زندگی کی حقیقی گہرائیوں سے بلند ہوتی اور رسول اللہ ﷺ کے قلب سے پوری شدت کے ساتھ ٹکراتی اور شعور کی سطح پر نمودار ہوتی ہے؟

نیز قرآن اور وحی الٰہی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات سے خارج، ماوراء اور جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ آپ پر معروض ہے؟

یا آپ کی اعلیٰ وارفع ذات کا داخلی، روحانی ارتقاء ہے، نہ کسی بھی خارجی ہستی (جبرئیل علیہ السلام) کا اس میں مطلق دخل ہے، نہ ہی جبرئیل علیہ السلام کوئی خارجی ہستی ہے؟

یا قرآن مجید پورا کلام اللہ بھی ہے، اسی طرح پورے کا پورا محمد ﷺ کا کلام بھی ہے؟

قرآن مجید، وحی الٰہی، جبرئیل امین علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس سے متعلق یہ چند اہم اور بنیادی سوالات ہیں جن کے جوابات کے لئے ہم اول خود قرآن مجید کی طرف ہی رجوع کرتے ہیں، اس لئے کہ کسی کے متعلق سوال کا جواب وہی معتبر مانا جاتا ہے جو وہ خود بتا دے:

آفتاب آمد دلیل آفتاب

علاوہ ازیں ایک خدا پرست مومن مسلمان کے لئے تو ''مَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلاً'' (اللہ سے بڑھ کر اور کس کا قول (بیان) زیادہ سچا ہے؟) کے تحت اللہ جل وعلیٰ کے بیان کے سامنے اور کسی بھی ہستی کا تحقیقی بیان (چاہے وہ افلاطونِ وقت ہی کیوں نہ ہو) لائق اعتناء والتفات ہو ہی نہیں سکتا۔

قرآن اللہ جل وعلیٰ کا کلام ہے

ہٹ دھرم مشرکین وکفار مکہ رسول اللہ ﷺ کو ''لاجواب'' کرنے کی نیت سے کہا کرتے تھے: ''لولا یکلمنا اللہ؟'' یعنی اللہ تم ہی سے بات کرتا ہے، ہم سے بات کیوں نہیں کرتا؟

اللہ جل وعلیٰ نے آیت کریمہ میں اس کا جواب دیا ہے:

''وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْياً أَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلاً فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ''. (الشوریٰ:۵۱)

ترجمہ:...... ''کسی بھی بشر کی یہ مجال نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے بجز اس کے کہ وحی کے طور پر (بات کرے) یا (مانع رؤیت نوری) پردے کے پیچھے سے (بات کرے) یا کسی قاصد (ایلچی) کو بھیجے، پس وہ (قاصد) جو بات اللہ چاہے (اس بشر کے پاس) پہنچادے، بیشک وہ اللہ بہت ہی بلند (کائنات سے ماوراء) بڑی ہی حکمتوں والا ہے''۔

یعنی نہ اللہ جل جلالہ کی عظمت وجلال کے ہی شایانِ شان ہے کہ وہ اپنی ایک ''ماء مھین'' (حقیر پانی) سے پیدا شدہ مخلوقِ ضعیف، بشر سے رُودررُو بات کرے اور نہ ہی اللہ کے کلام کے ''ملکوتی ولاہوتی ثقل'' اور گرانی کی کوئی قوی سے قوی مادّی مخلوق، حتی کہ پہاڑ بھی، متحمل ہوسکتی ہے۔ ہاں! اس علیم وحکیم خالقِ کائنات نے اپنے لامحدود علم وحکمت کے تحت انسانوں تک (کہ وہی اس کلام کے مخاطب ومکلّف ہیں) اپنا کلام (قرآن) پہنچانے کی مذکورہ ذیل تین صورتیں نکال دی ہیں۔

اللہ جل وعلیٰ کے کلام کی تین صورتیں

چنانچہ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اولاً منکرین کا جواب دینے کے علاوہ ایک عام اصول اور سنت اللہ کے طور پر اللہ جل وعلیٰ سے شفاہاً (آمنے سامنے) کلام کرنے کے، بشری قدرت واستطاعت سے خارج ہونے کی بناء پر نفی فرمائی ہے، اس کے بعد بطور استثناء تین طریق پر اللہ جل وعلیٰ کے کسی بشر سے کلام فرمانے کا اثبات فرمایا ہے۔

۱...... ایک بطور وحی بات کرنا یعنی دل میں بات ڈال دینا۔

۲...... دوسرے پردے (رؤیت سے مانع نور) کے پیچھے سے بات کرنا۔

۳...... تیسرے کسی رسول (قاصد) کے ذریعہ اپنی بات پہنچادینا اور اس نفی اور اثبات کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ اللہ جل وعلیٰ کی ذات اقدس تمام کائنات سے اعلیٰ وارفع اور وراء الوراء ہے، کسی کی رسائی اس تک ممکن نہیں کہ اس سے بات کرے ''إِنَّهُ عَلِيٌّ'' ساتھ ہی وہ بڑی حکمتوں والا

ہے، اس لئے اس نے مذکورہ بالا تین طریق پر کلام کرنے کی راہ نکال دی ’’إِنَّهٗ حَكِيْمٌ ‘‘ بالفاظِ دیگر ’’عَلِيٌّ ‘‘ نفی کی دلیل ہے، ’’حَكِيْمٌ ‘‘ اثبات کی دلیل ہے۔

قرآن (اللہ کا کلام) تیسری صورت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا ہے۔

اس آیت کریمہ کے فوراً بعد دوسری آیت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کرکے آگاہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہارے پاس اپنا کلام (قرآن) مذکورہ بالا تین طریقوں میں سے تیسرے طریق پر یعنی بذریعہ رسول (قاصد) بھیجا ہے اور یہ کہ یہ ہمارا کلام جو ہم نے بھیجا ہے یہ کائنات کی ظلمتوں کو دور کرنے والا ایک نور ہے۔

جبرئیل کون ہیں؟

اسی کے ساتھ ساتھ اول اس رسول کے ملکی اوصاف بیان فرماتے ہیں اور پھر ان کا نام بھی بتلا دیتے ہیں، ارشاد ہے:

’’وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوْحاً مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْراً نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ‘‘۔ (الشوریٰ:۵۲)

ترجمہ:......’’اسی طرح ہم نے (اے نبی!) تمہارے پاس اپنے امر (حکم) سے، ایک روح (جبرئیل) کے ذریعہ وحی بھیجی ہے (اس سے پہلے، تم نہیں جانتے تھے کہ (آسمانی) کتاب کیا (ہوتی) ہے اور کیا ہے (اس پر) ایمان (لانا) لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت فرما دیتے ہیں‘‘۔

اس آیت کریمہ میں اس (ملکی) رسول (قاصد) کو جس کے ذریعہ اللہ جل وعلیٰ نے نور یعنی قرآن کو بھیجا ہے ’’أَوْحَيْنَا‘‘ کی مناسبت سے روح سے تعبیر فرمایا ہے، جیسے ’’یرسل‘‘ کی مناسبت سے پہلی آیت میں رسول سے تعبیر فرمایا تھا، لیکن سورۃ النحل میں اس رسول کو روح القدس کے لفظ سے تعبیر فرما کر اس ملکی رسول کے ’’ملکوتی تقدس‘‘ سے آگاہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

’’قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ‘‘۔ (النحل:۱۰۲)

ترجمہ:......’’(اے نبی!) تم کہہ دو اس (قرآن) کو تمہارے رب کی جانب سے روح القدس نے حق کے ساتھ اتارا ہے‘‘۔

اور سورۃ الشعراء میں ’’الروح الامین‘‘ کے لفظ سے تعبیر فرما کر اس رسول کی ’’امانت‘‘ (یعنی

بغیر کسی ادنیٰ تصرف کے اللہ کا کلام پہنچا دینے) کے متعلق اطمینان دلایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا ہے کہ یہ کتاب عربی زبان کی ہے، ارشاد ہے:

”وَإِنَّهُ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِکَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ“. (الشعراء:۱۹۲،۱۹۳،۱۹۴،۱۹۵)

ترجمہ:......”اور بیشک وہ (قرآن) اتارا ہوا ہے پروردگار عالم کا، اس کو اتارا ہے امانت دار (فرشتہ) نے تمہارے دل پر، تاکہ تم بھی خبردار کرنے والوں (انبیاء ورسل) میں شامل ہو جاؤ خالص عربی زبان میں“۔

اور سورۂ بقرہ کی آیت کریمہ ذیل میں اس رسول، روح، روح القدس، الروح الامین کا نام بھی بتلا دیا، ارشاد ہے:

”قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِکَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ“. (البقرۃ:۹۷)

ترجمہ:......”(اے نبی!) تم کہہ دو: (جو جبرئیل کا دشمن ہو (ہوا کرے) پس بیشک اس نے تو اس (قرآن) کو اللہ کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا ہے جو سچ بتانے والا ہے اس (کتاب آسمانی) کو جو اس سے پہلے ہے اور رہنمائی وخوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے“۔

اور سورۂ تکویر میں اس ملکی رسول کی عالم ملکوت میں عزت، عظمت، منزلت اور تمام فرشتوں پر سیادت یعنی اقتدار اعلیٰ سے آگاہ فرما کر یقین دلایا ہے کہ یہ کوئی معمولی درجہ کا فرشتہ نہیں ہے، بلکہ تمام عالم ملکوت میں سردار اور رب العرش العظیم کا سب سے مقرب فرشتہ ہے، اس لئے کہ جتنی عظیم ہستی کو قاصد بنا کر بھیجا جاتا ہے اتنی ہی ایک طرف اس کلام کی صداقت وواقعیت کی ضمانت ہوتی ہے، دوسری طرف مرسل الیہ (جس کے پاس بھیجا جاتا ہے) کی عزت افزائی اور پیغام بھیجنے والے (مرسِل) کے نزدیک اس کی قدر ومنزلت کا اظہار ہوتا ہے، ارشاد ہے:

”إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ“. (التکویر:۱۹،۲۰،۲۱)

ترجمہ:......”بیشک وہ (قرآن) ایک معزز قاصد کا (لایا ہوا) قول (کلام) ہے جو بڑی (روحانی) قوت والا ہے، عرش والے (مالک الملک) کے ہاں بڑے مرتبہ والا ہے، وہاں (سب کا) سردار ہے امانت دار (ثقہ اور معتمد) ہے“۔

(جاری ہے)

قرآن مجید کیا ہے؟

(۲)

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امینؑ کو دیکھا بھی ہے

اس توہّم کو دور فرمانے کی غرض سے کہ ممکن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وہم وخیال کے غلبہ اور تسلُّط کی وجہ سے کسی وہمی اور خیالی یا خود اپنی روحانی آواز کو فرشتہ کی آواز سمجھ لیا ہو، اللہ جل مجدہٗ توثیق فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس رسول کریمؑ کو بچشمِ خود اسی دنیا میں دیکھا ہے، ارشاد ہے: **وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِيْنِ**''۔(التکویر:۲۳)''اور بے شک اس نبیؐ نے اس رسول کریم (جبرئیلؑ) کو کھلے اُفق پر دیکھا ہے''۔

اُفق از روئے لغت آسمان (حدِ نظر) کے کنارے کو کہتے ہیں۔ اُفق کے ساتھ مبین (صاف اور واضح) کی صفت کا اضافہ کرکے یہ بتلا دیا کہ مطلع ابر آلود یا غبار آلود نہ تھا، بالکل صاف اور کھلا ہوا تھا، گویا جس طرح سورج کے زمین کے کرہ سے تقریباً ایک ہزار گنا بڑا اور کروڑوں میل دور ہونے کے باوجود طلوع ہوتے وقت زمین پر رہنے والے بلا کسی شک وشبہ کے یقینی طور پر سورج کو دیکھتے ہیں، حتیٰ کہ قسم تک کھا سکتے ہیں، اسی طرح اللہ جل وعلیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو اصلی ملکی صورت پر (جو انسانی تصور سے بالاتر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھلا بھی دیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیداری میں بچشمِ خود دیکھا بھی تھا، نگاہ کے دھوکہ یا بھٹکنے کا اس مشاہدہ میں کوئی امکان ہی نہیں، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوجائے کہ جس کی میں آواز سنتا ہوں یا میرے پاس انسانی شکل میں آتا ہے اور اللہ کا کلام پہنچاتا ہے، وہ یہی اللہ کا مقرب ترین فرشتہ ہے، کوئی بھوت پریت یا جن وغیرہ نہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

''**وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيْمٍ**''(التکویر:۲۵)''اور یہ کسی مردود شیطان کا قول وبات) بھی نہیں ہے''۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی شاعر قسم کے انسان بھی نہیں ہیں جو اپنے ضمیر کی آواز کو ہمیشہ ''غیبی آواز'' کہا کرتے ہیں، نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کاہن نجومی قسم کے آدمی ہیں جو ''تسخیر شیاطین'' کے ذریعہ ''غیب کی خبریں'' دیا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس سالہ مکی زندگی اس کی شاہد ہے، مکہ کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی عمر میں

کبھی کوئی شعر کہا اور نہ ہی کہانت کی (کوئی پیشین گوئی کی) اسی لئے ارشاد ہے:

''وَمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِیْلاً مَا تُؤْمِنُوْنَ''۔ (الحاقہ:۴۱)

''اور نہ ہی کسی شاعر کا قول (کلام) ہے، تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو''۔

''وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ قَلِیْلاً مَا تَذَکَّرُوْنَ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِیْنَ''۔ (الحاقہ:۴۲،۴۳)

''اور نہ ہی کسی کاہن (نجومی) کا قول (پیشنگوئی) ہے، تم کچھ بھی دھیان نہیں دیتے (ارے عقل کے دشمنو!) یہ تو پروردگار عالم کی نازل کردہ کتاب ہے''۔

اس پہلو سے یقین دہانی اور ہر قسم کے شکوک وشبہات کے ازالہ اور بیخ کنی کے باوجود بھی جو ضدی اور ہٹ دھرم دشمن قرآن کو اللہ کا کلام آج تک بھی نہیں مانتے، بلکہ ''زندگی کی حقیقی گہرائیوں سے بلند ہونے والی آواز'' (ضمیر کی آواز) یا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ''روحانی تجربہ'' یا ''داخلی ارتقاء'' کہنے سے باز نہیں آتے، ان سے بتقاضاءِ ''ربوبیت'' انتہائی ناصحانہ اور متأسفانہ انداز میں خطاب فرماتے ہیں، ارشاد ہے:

''فَأَیْنَ تَذْھَبُوْنَ إِنْ ھُوَ إِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ لِمَنْ شَاءَ مِنْکُمْ أَنْ یَّسْتَقِیْمَ''۔ (التکویر:۲۶،۲۷،۲۸)

ترجمہ:...... ''پس (اے اپنی جان کے دشمنو!) تم کہاں جارہے ہو؟ (جہنم میں؟) یہ (قرآن) تو تمام عالم والوں کے لئے ایک نصیحت (کی کتاب) ہے اس شخص کے لئے جو سیدھی راہ پر چلنا چاہے''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیلؑ کو ان کی اصلی ملکی صورت پر ایک مرتبہ اور بھی دیکھا ہے، نہ صرف یہ، بلکہ آسمان کی بلندیوں سے اپنے پاس آتا اور بات کرتا بھی دیکھا ہے۔ اور سورۂ والنجم میں اسی اُفق مبین کو اس کی بلندی ظاہر کرنے کی غرض سے اُفق اعلیٰ سے تعبیر فرمایا ہے اور ساتھ ہی اس ملکی رسول کے اُفق اعلیٰ آسمان کے بلندترین کنارے پر سیدھا کھڑا ہوکر دیکھنے اور پھر اس خارقِ عادت بلندی سے غیر معمولی طور پر اُتر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل پاس آجانے اور اللہ جل جلالہٗ کی وحی (کلام) پہنچانے کا بھی ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے:

''فَاسْتَوٰی وَھُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰی ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ أَوْ أَدْنٰی فَأَوْحٰی إِلٰی عَبْدِہٖ مَا أَوْحٰی مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰی''۔ (النجم:۶،۷،۸،۹،۱۰،۱۱)

ترجمہ:...... ''پس وہ (وجیہ فرشتہ) سیدھا کھڑا ہوگیا اور وہ (اس وقت) بلندترین افق (آسمان کے کنارے) پر تھا، پھر وہ آپ سے قریب ہوا تو وہ (اوپر سے نیچے) اتر آیا اور وہ دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی زیادہ قریب ہوگیا، پھر اس نے اللہ کے بندے کو وہ وحی پہنچائی جو بھی اللہ نے بھیجی، جو کچھ آپ نے دیکھا دل نے اس کو نہیں جھٹلایا''۔

'' تدلی '' کے معنی ہیں اوپر سے لٹک کر نیچے آنا، جیسے کنویں سے پانی نکالنے کے وقت ڈول اوپر سے نیچے پانی کی سطح پر آتا ہے۔ عربی میں ''دلو'' پانی نکالنے کے ڈول کو کہتے ہیں، اسی سے ''تدلی'' ماخوذ ومشتق ہے، لہٰذا آیت کریمہ کے معنی یہ ہوئے کہ جبرئیل امینؑ اپنی اصلی ملکی صورت پر اول ''اُفق اعلیٰ'' پر

سیدھے کھڑے ہوئے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہونے کی غرض سے آہستہ آہستہ اتر آئے، یعنی انسانی شکل میں آگئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجہ قریب ہوکر ''وحی الٰہی'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی، بالفاظِ دیگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیلؑ کے ملکوتی شکل سے انسانی شکل میں آنے کا بھی بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا انسانی شکل میں انسان کے پاس آنا اور بتلانے سے پہلے اس شخص کا اُن کو انسان سمجھنا اور پھر دو انسانوں کی طرح آپس میں باتیں کرنا، اس مقام کے علاوہ بھی قرآن سے ثابت ہے، عنقریب آپ پڑھیں گے۔ چونکہ یہ واقعہ تمام تر ملکوتی حقائق پر مبنی ہونے کی وجہ سے انسانی عقل وقیاس بلکہ تصور سے بھی بالاتر ہے، عام سننے والا بے ساختہ اس کو ایک افسانوی داستان اور فرضی کہانی کہے گا، اس لئے اللہ جل مجدہٗ انسانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ واقعہ سرتاسر حقیقت ہے، اس میں وہم وخیال یا کذب وگمان کا مطلق دخل نہیں، نہ نگاہ کا دھوکہ ہے، بلکہ نبی علیہ السلام کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، آپ کا دل ودماغ اور عقل وحواس کی تصدیق کررہے تھے، ارشاد ہے: ''مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى''، ''جو کچھ آپؐ نے دیکھا دل (ودماغ) نے اس کو نہیں جھٹلایا''، یعنی جیسے ریل میں سفر کرتے وقت اِدھر اُدھر کے درخت آپ کو دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر آپ کا دل ودماغ آنکھوں کی تکذیب کرتا ہے یا سورج آپ کو زمین کے ارد گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے، مگر سائنسی تجربات اس کی تکذیب وتردید کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مشاہدہ ایسا ہرگز نہ تھا، بلکہ آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، نورِ ایمان سے منور عقل وخرد اس کی تصدیق کررہی تھی، یہ خالق کائنات کی شہادت ہے ''وكفى بالله شهيدا'' مگر قادرِ مطلق خالق کائنات جلت قدرتہ کی معرفت سے ناآشنا اور اس کی (انسانی عقل وخرد کی رسائی سے وراء الوراء) صفات وکمالات پر ایمان سے محروم ''دلوں کے اندھے'' عقلیت پرست اس وقت بھی کچھ کم نہ تھے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس خرقِ عادت واقعہ (جبرئیل امینؑ کو ان کی صورت پر کھڑا ہوا اور اُفق اعلیٰ سے اُتر کر اپنے پاس انسانی شکل میں آتا ہوا دیکھنے اور وحی الٰہی پہنچانے) پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا کرنا شروع کردیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تو اسی طرح محال ہے جیسے کوئی کہے سورج میرے پاس آگیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگا، یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کو دھوکا لگا ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خیالی اور وہمی صورت کو دیکھا ہے، اللہ جلت قدرتہ ایسے کٹھ حجتیوں کو خطاب کرکے ارشاد فرماتے ہیں: ''أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ''، ''کیا تم اس (اپنے نبی سے) اس چیز پر جھگڑا کرتے ہو جو وہ (بچشمِ خود) دیکھتا ہے؟''۔

اس کے بعد بطور تائید مزید فرماتے ہیں: تم اس مَلَکی رسول (جبرئیلؑ) کو اُفق اعلیٰ سے اتر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زمین پر آجانے اور وحی الٰہی پہنچانے پر ہی جھگڑا کررہے ہو، حالانکہ اس سے بڑھ کر قدرتِ خداوندی کا کرشمہ تو یہ ہے کہ یہ تمہارے نبی اس مَلَکی رسول کو نہ صرف زمین پر، بلکہ معراج کے موقعہ پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جہاں جنت المأویٰ ہے اُترتے وقت بھی ایک مرتبہ دیکھ چکے ہیں، ارشاد ہے:

”وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى“. (النجم:۱۳،۱۴،۱۵)

ترجمہ:...... ”اور بخدا اس تمہارے نبی نے تو اس (ملکی رسول) کو ایک مرتبہ اور اُترتے وقت سدرۃ المنتہٰی کے پاس جس کے قریب جنت الماویٰ ہے، دیکھا ہے“۔

بہرحال قرآن عظیم کی مذکورہ بالا آیات سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور جبرئیل امینؑ نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچایا۔ باقی رہا یہ امر کہ جبرئیل امینؑ قرآن کریم کی آیات لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کس شکل وصورت میں آتے تھے؟ آیا کسی انسان کی شکل وصورت میں آتے تھے؟ یا اپنی اصلی ملکی شکل وصورت میں آتے تھے؟ اس کی تحقیق قرآن کریم کے ان الفاظ سے بخوبی ہوجاتی ہے جن سے جبرئیل امینؑ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لانے اور پہنچانے کو تعبیر فرمایا ہے۔

جبرئیل امینؑ قرآن کی آیات انسانی شکل وصورت میں لے کر آتے تھے اس کا ثبوت

قرآن عظیم میں جن الفاظ سے قرآن کی آیات لانے اور پہنچانے کا ذکر فرمایا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل امین علیہ السلام دونوں صورتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن لے کر آئے ہیں اور پہنچایا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے وحی الٰہی اور اللہ کا کلام لانے کو متعدد آیات میں تعلیم کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ جل جلالہٗ اول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہر لفظ کے وحی الٰہی ہونے کی تصدیق فرماتے ہیں، ارشاد ہے:

”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحٰى“. (النجم:۳،۴)

ترجمہ:...... ”اور وہ تمہارے (نبی) اپنی طرف سے کچھ نہیں بولتے، وہ تو (جو کچھ بولتے ہیں وہ) خالص وحی ہوتی ہے جو بھیجی جاتی ہے“۔

اس کے بعد ارشاد ہے:

”عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ“. (النجم:۵)

”تعلیم کرتا ہے اس (تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک زبردست (روحانی) قوتوں والا خوش منظر (فرشتہ جبرئیل)“۔

گویا ہر وحی خداوندی جو وہ ملکی رسول آپ کے پاس لے کر آتا ہے اس کی آپ کو ”تعلیم“ دیتا ہے۔ یاد رکھئے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن اور علوم الٰہیہ کی اصل تعلیم دینے والے تو اللہ جلت عظمتہ ہیں، ارشاد ہے:

”الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ“۔ ”بہت بڑے مہربان (پروردگار) نے قرآن کی تعلیم دی ہے“۔

اور سورۂ نساء میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد ہے: ”وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ“۔ ”اور (اے نبی!) تم کو وہ تعلیم دی جس کو تم (اس سے پہلے) نہیں جانتے تھے“۔

مگر چونکہ یہ تعلیم جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ سے ہے اور سورۂ نجم میں اسی ”واسطہ“ (جبرئیل

امینؑ) کا تعارف کرانا مقصود ہے، اس لئے اس تعلیم کو جبرئیل امینؑ کی طرف منسوب فرمایا ہے، یعنی اللہ جل جلالہٗ نے اپنے اس کلام قرآن اور علوم الٰہیہ کی تعلیم براہ راست نہیں دی، بلکہ جبرئیل امینؑ کے واسطہ سے دی ہے۔

اسی طرح اللہ جل مجدہٗ نے اپنے کلام (قرآن) کے پہنچانے کو قرأت (پڑھانے) سے تعبیر فرمایا ہے اور اشتباہ کو دور کرنے کی غرض سے اس ''پڑھانے'' کو بھی اپنی طرف منسوب فرمایا، حالانکہ یہ ''پڑھانا'' بھی جبرئیل امینؑ کے واسطہ سے ہے اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھول جانے کے خوف سے یا جبرئیل امینؑ کے چلے جانے کے بعد نہ پڑھ سکنے کے اندیشہ سے حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ ساتھ پڑھنے اور دُہرانے کی کوشش کرتے تھے، اس لئے اس ساتھ ساتھ پڑھنے سے منع فرماتے ہیں اور اطمینان دلاتے ہیں کہ نہ تم اس قرآن کو بھولو گے اور نہ جبرئیلؑ کے واپس آنے کے بعد قرآن کو پڑھنے میں کوئی دشواری پیش آئے گی۔ سورۂ اعلیٰ میں ارشاد ہے:

''سَنُقْرِؤُکَ فَلَا تَنْسٰی إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ إِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰی ''. (الاعلیٰ:۶،۷)

ترجمہ:...... ''ہم (جبرئیلؑ کے واسطہ سے) تم کو پڑھا دیا کریں گے تو تم بھولو گے (ہرگز) نہیں، بجز اس کے جو خود اللہ بھلانا چاہے، بے شک وہی جانتا ہے علانیہ اور پوشیدہ (حکمتوں اور مصلحتوں) کو''۔

سورۂ قیامہ میں ارشاد ہے:

''لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ إِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْآنَهٗ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهٗ ثُمَّ إِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ''. (القیامۃ:۱۶،۱۷،۱۸،۱۹)

ترجمہ:...... ''تم قرآن کو جلدی (سے پڑھ لینے) کی غرض سے اپنی زبان کو نہ ہلایا کرو (ساتھ ساتھ نہ پڑھا کرو) بے شک ہمارے ذمہ ہے اس کو (تمہارے دل میں) جمع کردینا (یاد کرادینا) اور اس کو پڑھا دینا (زبان پر جاری کرادینا) پس ہم (یعنی ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے جبرئیلؑ) پڑھیں تو تم کان لگا کر سنا کرو پھر (یہ یاد کرانا اور پڑھانا ہی نہیں، بلکہ) اس (کے معانی ومطالب) کا بیان کردینا (بھی) ہمارے ذمہ ہے''۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے:

'' وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ یُّقْضٰی إِلَیْکَ وَحْیُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْماً''. (طٰہٰ:۱۱۴)

ترجمہ:...... ''اور تم اس (قرآن) کی وحی کے پورا ہونے سے پہلے (قرآن کے) پڑھنے کی جلدی مت کیا کرو (نہ تم اس کا ایک حرف بھی بھولو گے، نہ پڑھنے اور زبان سے ادا کرنے میں دشواری محسوس کروگے) اور کہا کرو (دعا کیا کرو) اے رب! تو میرے علم کو اور زیادہ فرمادے''۔

ان تینوں آیتوں میں رسول اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام انسانوں کی طرح پڑھنے کے آداب اور طریقوں کی ہدایت فرمانا اور پڑھائی میں مخل باتوں سے منع فرمانا قطعاً اس کی دلیل ہے کہ قرآن پڑھانے والا انسانوں کی

طرح آپ کو قرآن پڑھاتا ہے۔ علاوہ ازیں عربی زبان کی ایک کتاب کی آیات پڑھانے کے وقت چہل سالہ عربی اللسان فصیح و بلیغ رسول کی غیر معمولی اضطرابی کیفیت اور اس کے زبان پر جاری ہونے اور دل میں محفوظ رہنے کے متعلق یہ بے اطمینانی جس کا اظہار ان آیات سے ہو رہا ہے اور جس کو اللہ جل شانہٗ بار بار دور فرما رہے ہیں اور ''پڑھا دینے'' اور ''یاد کرا دینے'' کو اپنے ذمہ لے رہے ہیں، اس امر کی روشن دلیل ہے کہ قرآن نہ کسی انسان کا کلام ہے اور نہ قرآن کوئی عام عربی زبان کی کتاب ہے، بلکہ اللہ جل جلالہٗ کا کلام ہے جس کے ''لاہوتی ثقل'' کا عالم یہ ہے ''پہاڑ'' جیسی عظیم اور محکم مادی مخلوق پر بھی (جو نہ بڑے سے بڑے زمین کے آتشیں زلزلوں سے ٹس سے مَس ہو اور نہ بڑے سے بڑے بادوباراں کے طوفانوں اور جھکڑوں سے اپنی جگہ سے ہلے) یہ قرآن اتار دیا جاتا تو خوف وخشیت الٰہی سے دہنس جاتا اور ریزہ ریزہ ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک تو بہرحال ایک مضغۂ لحم (گوشت کا ٹکڑا) ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک بھی ''خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفاً'' کے مطابق ایک ضعیف وناتواں مخلوق ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب وزبان تو کیسے اور کیونکر اس ثقل کے متحمل ہو سکتے تھے؟ یہ تو محض اللہ جلت حکمته نے عالم ملکوت کی ایک عظیم روحانی قوتوں والی ''روح اعظم'' جبرئیل امینؑ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینے اور پڑھانے کے واسطے تجویز کر کے ان کو انسانوں کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھانے کے لئے مامور فرما دیا، تاکہ قرآن کے اس ''لاہوتی ثقل (جس کی شہادت سورۂ حشر کی مذکورہ بالا آیت کریمہ دے رہی ہے) اور شدت کی کچھ یہ روح اعظم متحمل ہو جائے اور کچھ...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب (ذی شعور روح) اور زبان متحمل ہوں۔ پھر بھی قرآن عظیم کی سب سے پہلی پانچ آیتوں کے پڑھانے کے وقت اگر جبرئیل امینؑ بار بار کے ضم وضغط (سینے سے لگانے اور بھینچنے) کی ''تکوینی تدبیر'' کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت کو قوی سے قوی تر نہ کرتے (جس کی تفصیل مشہور ومتواتر حدیث میں مذکور ہے، مراجعت کیجئے صحیح بخاری باب بدء الوحی کی) تو یہ قرآن (اللہ کا کلام) نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر جاری ہو سکتا اور نہ امت ہی قرآن کی تلاوت کی سعادت حاصل کر سکتی۔ بہرحال اللہ جل مجدہٗ کا سورۂ قیامہ کی آیت کریمہ ''إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ'' کے ذریعہ یاد کرا دینے اور زبان سے ادا کرا دینے کو اپنے ذمہ لینا اس امر کی قطعی اور روشن دلیل ہے کہ قرآن کسی انسان کا عربی کلام یقیناً نہیں ہے، جس کے زبان سے ادا کرنے اور یاد رکھنے کے بارے میں ایک چہل سالہ افصح العرب والعجم جس کی مادری زبان عربی ہے اس قدر مضطرب اور بے چین ہو، جس کا اظہار ان تینوں آیتوں سے ہو رہا ہے، جبکہ عام اہل عرب کے حافظہ کا یہ عالم ہے کہ ایک مجلس میں صرف ایک مرتبہ کے سنے ہوئے دس پانچ نہیں سینکڑوں اشعار ان کو یاد ہو جاتے تھے اور فوراً کے فوراً وہ ان کو دہرا دیتے تھے اور عمر بھر یاد رہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً عرب کے ان خلقی اور فطری خصائل سے بدرجۂ اتم بہرہ یاب تھے۔

(جاری ہے)

قرآن مجید کیا ہے؟

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ

(۳)

اسی لئے اللہ جل شانہٗ نے ان پانچ آیات کے پڑھانے کے بعد (چند ماہ کے وقفہ سے) نازل ہونے والی دوسری سورت المزمل میں ''قَوْلًا ثَقِيْلًا '' کے الفاظ میں اس انسانی تصور سے بالاتر قرآن کے لاہوتی ثقل اور شدت سے آپ ﷺ کو باخبر کر دیا تھا اور ''لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ الخ '' کی تمثیل سے قرآن کے ثقل اور شدت سے پوری طرح آگاہ بھی فرما دیا تھا، تاکہ آپ ﷺ اس ہوش ربا ثقل اور شدت کے برداشت کرنے کے لئے پہلے سے تیار رہیں اور قرآن اترنے کے وقت آپ ﷺ کی حالت کا مشاہدہ کرنے والے صحابہؓ خصوصاً ازواج مطہراتؓ بھی نہ گھبرائیں، لہٰذا قرآن کریم کی یہ آیتیں ان احادیث صحیحہ کی قطعاً تصدیق وتوثیق کرتی ہیں، جن میں قرآن اترنے کے وقت آپ ﷺ کے جسم مبارک پر خلاف معمول اور خارق عادت قسم کی کیفیات طاری ہونے کا تفصیلی بیان وارد ہے۔

بہرصورت رسول اللہ ﷺ کو قرآن ''پڑھانے'' سے متعلق مذکورہ بالا آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ جبرئیل امینؑ اپنی اصلی ملکی صورت سے اتر کر (جس کے مشاہدہ کی تصریح آپ سورۂ نجم کی آیت میں پڑھ چکے ہیں) انسانی شکل وصورت میں آپ ﷺ کے پاس آتے، آپ ﷺ ان کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے، وہ آپ ﷺ کو انسانوں کی طرح قرآن کریم کی آیات پڑھاتے، آپ ﷺ پڑھتے، وہ تعلیم دیتے، آپ ﷺ تعلیم حاصل کرتے، وہ آپ ﷺ کو اللہ کا کلام (قرآن کی آیات) سناتے، آپ ﷺ سنتے تھے، بالکل دو انسانوں (معلم ومتعلم) کی طرح معاملہ ومکالمہ ہوتا تھا۔ روح اعظم جبریل امین علیہ السلام صرف آپ ﷺ کے پاس ہی انسانی شکل وصورت میں نہیں آئے ہیں، بلکہ قرآن کی تصریح کے مطابق حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھی اسی طرح انسانوں کی شکل میں آئے ہیں اور ان سے انسانوں کی طرح باتیں کی ہیں۔ سورۂ مریم میں ارشاد ہے:

''فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَراً سَوِيّاً، قَالَتْ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيّاً، قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَاماً زَكِيّاً، قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيّاً، قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ''. (مریم:۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱)

ترجمہ:...... ’’تو ہم نے مریم کے پاس اپنے ایک فرشتہ کو بھیجا تو وہ مریم کے سامنے ایک توانا وتندرست آدمی بن کر آیا، تو مریم نے کہا: میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ لیتی ہوں، اگر تو متقی پرہیزگار ہے، تو اس نے کہا: اس کے سوا نہیں میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں کہ تجھ کو ایک پاک وصاف لڑکا دے جاؤں۔ مریم نے کہا: میرے لڑکا کہاں سے ہوگا؟ درانحالیکہ نہ کسی آدمی نے مجھے (بیوی کے طور پر) ہاتھ لگایا، نہ ہی میں کبھی بدکار عورت ہوئی، تو اس (فرشتہ) نے کہا: یونہی ہے، تیرے رب نے فرمایا ہے، یہ (بغیر باپ کے بیٹا پیدا کر دینا) میرے لئے بہت آسان ہے‘‘۔

دیکھئے! اس واقعہ میں بھی وہی روح جس کا ذکر آپ سورۂ حشر کی آیات میں ’’رُوْحاً مِّنْ أَمْرِنَا‘‘ کے عنوان سے پڑھ چکے ہیں اور وہی ’’أرسلنا‘‘ اور ’’رسول‘‘ کے الفاظ جو ’’أَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلاً‘‘ کے عنوان سے انہی آیات میں پڑھ چکے ہیں موجود ہیں (دونوں کو آمنے سامنے رکھ کر غور کیجئے)۔

اس آیت کریمہ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ روح امین (جبرئیل) علیہ السلام حضرت مریمؑ کے سامنے ایک توانا وتندرست نوجوان کی شکل وصورت میں آئے ہیں، چنانچہ وہ تنہائی میں ایک توانا وتندرست نوجوان کو موجود دیکھ کر اور بلا تردُّد اُن کو انسان سمجھ کر ڈری ہیں اور دست درازی کے خطرہ کی بناء پر ان کی پرہیزگاری کا واسطہ دے کر رحمٰن کی پناہ لینے پر مجبور ہوئی ہیں اور جب جبرئیل امینؑ نے ان کو قطعی طور پر اطمینان دلا دیا ہے کہ میں انسان ہرگز نہیں ہوں، بلکہ اللہ جل جلالہٗ کا فرستادہ فرشتہ ہوں، تب مطمئن ہوکر ان سے بالکل انسانوں کی طرح باتیں کی ہیں (جن کی پوری تفصیل سورۂ مریم میں پڑھیں)۔

بالکل اسی طرح حضرت جبرئیلؑ انسانی شکل وصورت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تھے، آپ ﷺ کو چونکہ جبرئیل امینؑ کو ان کی اصلی صورت پر بھی اور اس سے اتر کر انسانی شکل میں آتا ہوا بھی دکھلا دیا گیا تھا اور آپ ﷺ بچشم خود جبرئیل امینؑ کے اس تمثل اور ’’تَدَلِّی‘‘ کا مشاہدہ کر چکے تھے، اس لئے آپ ﷺ کو ان کے پہچاننے میں کبھی تردد وتذبذب نہیں ہوا (تاہم جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے جبرئیل امینؑ آپ ﷺ کے پاس ایک ہی غیر معمولی) حسین وجمیل اور توانا وتندرست انسان کی شکل میں عموماً آیا کرتے تھے۔ (آپ ﷺ کی جسمانی حالت میں تغیر اور اضطرابی کیفیت صرف کلام الٰہی کے غیر معمولی ثقل اور وحی الٰہی کی شدت پر مبنی تھی، جیسا کہ آپ قرآن کریم کی تصریحات کی روشنی میں پڑھ چکے ہیں۔

جبرئیل امینؑ کے قرآن لے کر آنے کی دوسری صورت

جبرئیل امینؑ کے آپ ﷺ کے پاس قرآن لے کر آنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ: ایک مرتبہ سورۂ تکویر کی آیت کریمہ ’’وَلَقَدْ رَآہُ بِالْأُفُقِ الْمُبِیْنِ‘‘ کے تحت دوسری مرتبہ سورۂ والنجم کی آیت ’’فَاسْتَوٰی وَھُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰی‘‘ کے تحت) ہی خرق عادت کے طور پر آپ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ ﷺ کے قلب (گوشت کے ٹکڑے پر نہیں، بلکہ ذی شعور روح) قرآن کریم کی آیات کا القاء

کریں۔اس صورت میں آپ ﷺ دل کی آنکھوں سے ہی ان کو دیکھتے اور دل کے کانوں سے ہی قرآن کی آیات سنتے اور اللہ جل مجدہ کے وعدہ کے مطابق فوراً آپ ﷺ کو یاد اور آپ ﷺ کی زبان پر جاری ہوجاتیں۔اس دوسری صورت کا ذکر اللہ جلت عظمتہ نے اپنی ذات مقدس کی طرف نسبت کرکے تو سورۂ مزمل کی آیت ذیل میں ذکر فرمایا ہے:

۱......"وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلاً إِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَيْکَ قَوْلاً ثَقِيْلاً". (المزمل:۴)

ترجمہ:......"اور (اے مزمل! کملی پوش!) تو آہستہ آہستہ قرآن پڑھا کر، بے شک ہم (رفتہ رفتہ) تجھ پر (جبرئیلؑ کے ذریعہ) بڑا بھاری قول (کلام) ڈالیں گے"۔

چونکہ یہ القاء جبرئیل امینؑ کے واسطہ سے ہے، براہ راست نہیں، مگر ہے اللہ جل جلالہ کی جانب سے، لہٰذا سورۃ النحل میں اس القاء کو بصورتِ فعل مجہول ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے:

۲......"إِنَّکَ لَتُلَقَّی الْقُرْآنَ مِنْ لَّدُنْ حَکِيْمٍ عَلِيْمٍ". (النمل:۶)

ترجمہ:......"بے شک (اے نبی!) تم پر یہ قرآن القاء کیا جارہا ہے، بڑی حکمت والے، بڑے ہی علم والے (پروردگار) کے پاس سے"۔

یعنی اللہ جلت حکمتہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کوہ شکن لاہوتی کلام کے تم براہِ راست متحمل نہیں ہوسکتے، اس لئے روح القدس جبرئیل امینؑ کو اس کا حامل بنایا اور ان کے واسطہ تمہارے قلب روح شاعرہ پر یہ القاء کیا جارہا ہے، تاکہ اس قرآن کے لاہوتی ثقل کے اول یہ شدید القویٰ روح (جبرئیلؑ) متحمل ہوجائیں (کہ ملکوتی روح ہونے کی وجہ سے ان کے لئے فی الجملہ آسان ہے) اس کے بعد تمہارے قلب روح شاعرہ کے لئے (جس کی خرق عادت کے طور پر بار بار کے شق صدر، اور خود جبرئیلؑ کے ضم وضغط کے ذریعہ ہم نے عام بشری روحوں سے قوی تر بنادیا ہے، اس قرآن کا تحمل آسان ہوجائے، ایک نبی مرسل بشر) محمد ﷺ تک قرآن عظیم (اللہ کا ازلی ابدی کلام) پہنچانے کی یہ تکوینی تدبیر ہمارے وسیع علم وحکمت پر ہی مبنی ہے کہ ہم ہی تمام کائنات اور ملکوتی وناسوتی (مادی) مخلوق اور ان کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف اور باخبر ہیں اور جو چاہیں بآسانی کرسکتے ہیں۔سورۃ الشعراء کی آیت کریمہ ذیل میں آپ ﷺ کے قلب مطہر پر اس قرآن (کلام اللہ) کو اتارنے والے ملکی رسول جبرئیل امینؑ کی طرف نسبت کی تصریح فرماتے ہیں، ارشاد ہے:

۳......"وَإِنَّهُ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ". (الشعراء:۱۹۲،۱۹۳،۱۹۴)

ترجمہ:......"اور بے شک یہ (قرآن) پروردگار عالم کا اتارا ہوا (کلام) ہے، اس کو اتارا ہے روح امین (جبرئیلؑ) نے تاکہ تم بھی خبر دار کردینے والے (نبیوں) میں سے ہوجاؤ"۔

اور سورۂ بقرہ میں ان کے نام کی بھی تصریح فرمادی ہے:

۴......"قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِکَ بِإِذْنِ اللهِ". (البقرۃ:۹۷)

ترجمہ:......''(اے نبی!) تم کہہ دو: جو جبرئیل کا دشمن ہو (ہوا کرے) پس بے شک جبرئیل نے تو اللہ کے اذن سے تمہارے دل پر اس قرآن کو اتارا ہے''۔

ان چاروں آیات میں ''**القاء، تلقی**'' اور ''**علی قلبک**'' کی تصریحات اس امر کو ظاہر کرتی ہیں کہ جبرئیل امینؑ نے اپنی ملکی صورت پر رہتے ہوئے بھی قرآن کریم کی آیات آپ ﷺ کے قلب مطہر پر اتاری ہیں اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ آپ ﷺ کی روح شاعرہ اس عالم بشری سے منسلخ (الگ) ہو کر روح الامین کو دیکھتی اور پہچانتی بھی تھی اور ان سے قرآن کی آیات اخذ بھی کرتی تھی۔ یہی معنی ہیں دل کی آنکھوں سے دیکھنے اور دل کے کانوں سے سننے کے، جیسا کہ آیت کریمہ نمبر:۲ کے لفظ ''إِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ'' بے شک تمہارے اوپر قرآن ڈالا جارہا ہے۔ یہ ظاہر ہے اور چونکہ اللہ جل جلالہ کی طرف سے ڈالا جارہا ہے، اس لئے ''مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ'' کی تصریح فرمادی اور چونکہ ڈالنے والے جبرئیل امینؑ ہیں، اس لئے آیت کریمہ نمبر:۳ میں ''**الروح الأمین**'' کی تصریح فرمادی کہ بلاواسطہ نہیں، بلکہ ''**الروح الأمین**'' کے واسطے سے ڈالا جارہا ہے اور چونکہ ہر آیت یا آیات جبرئیل امینؑ اپنے ارادہ اور اختیار وانتخاب سے نہیں لاتے تھے، اس لئے آیت کریمہ نمبر:۴ میں ''**باذن اللّٰہ**'' کی تصریح فرمادی کہ جبرئیلؑ اللہ کی اجازت اور حکم سے قرآن کی آیات لاتے اور اتارتے ہیں چنانچہ جمہور محدثین ومفسرین اللہ کے کسی بشر سے کلام کرنے کی تین صورتوں سے (جن کا ذکر آپ سورۃ الشوریٰ کی آیت میں پڑھ چکے ہیں) پہلی صورت ''إِلَّا وَحْيًا'' کا مصداق جبرئیل امینؑ کے دوسری صورت میں (کہ وہ خود اپنی ملکی صورت پر ہیں اور آپ ﷺ کی روح شاعرہ عالم بشری سے الگ ہو کر اخذ کرے) قرآن کی آیات پہنچانے کو ہی قرار دیتے ہیں۔ صحیح بخاری اور دوسری تمام کتب صحاح کی معروف ومشہور حدیث جس میں رسول اللہ ﷺ ''**کیف یأتیک الوحی؟**'' کے جواب میں خود فرماتے ہیں: ''**کل ذلک یاتینی الملک**'' اور اس صورت کو آپ ﷺ ''**وھو أشدہ علی**'' (اور یہ وحی مجھ پر سب سے زیادہ شدت کا موجب ہوتی ہے) فرماتے ہیں (ظاہر ہے کہ بتقاضاء بشریت بیداری کی حالت میں روح شاعرہ کا عالم بشری سے منسلخ (الگ اور بےتعلق ہونا آپ ﷺ کے بدن کے لئے انتہائی شدت اور نظام جسمانی کے اختلال کا موجب ہونا چاہئے اور وحی آنے کے وقت جو جسمانی اعتبار سے غیر معمولی ''ربودگی'' کی کیفیت اور مختلف شدت کے آثار آپ ﷺ پر طاری ہوتے تھے، جن کی تفصیلات چشم دید گواہوں یعنی صحابہؓ وازواج مطہراتؓ نے احادیث میں بیان کی ہیں، اس کا سبب بھی یہی روح شاعرہ کا عالم مادی سے اتنی دیر کے لئے بےتعلق اور الگ ہونا ہے۔

یاد رکھئے! کہ قرآن عظیم کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم انسانی میں دو روحیں کارفرما ہیں، ایک روح حیات جس پر جسمانی نظام حیات کا مدار ہے، یہ پیدا ہونے کے بعد سے مرتے دم تک ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں ہوسکتی، اسی پر زندگی کا انحصار ہے اور ایک روح شاعرہ جو معمولاً سونے کے وقت ہر سونے والے کے بدن سے جدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

”اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْأَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْأُخْرٰی إِلٰی أَجَلٍ مُّسَمًّی“۔ (الزمر:۴۲)

ترجمہ:......”اوراللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اوران جانوں کو بھی کہ جن کی موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت، پھران جانوں کو تو روک لیتا ہے جن پرموت کا حکم فرماچکا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعادِ معین تک کے لئے رہا کردیتا ہے“۔

خرق عادت یہی تھا کہ وحی آنے کے وقت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بدن مبارک سے آپ ﷺ کی روح شاعرہ بیداری میں بےتعلق ہوکر جبرئیل امینؑ سے وحی الٰہی اخذ کرنے میں منہمک ہوجاتی تھی۔ باقی رہا آپ ﷺ کا ادراک وشعور تو وہ اس حالت میں اعلیٰ درجہ پر کام کرتا تھا، اسی لئے وحی الٰہی فوراً کے فوراً قلب مبارک پر یعنی عقل وشعور میں پتھر کی لکیر کی طرح نقش اور ثبت ہوجاتی تھی۔ تفصیل کے لئے کسی دوسری فرصت کا انتظار کیجئے۔ یہ چند سطریں بھی اس لئے سپردِ قلم کی گئی ہیں کہ ناواقف اور سادہ لوح قارئین کے ذہن میں یہ خلجان پیدا نہ ہو کہ جب آپ ﷺ کی روح بدن سے بےتعلق رہتی تھی تو آپ ﷺ زندہ کیسے رہتے تھے؟۔

قرآن کی وہ تمام نصوص اور صریح آیات جو ہم نے اب تک پیش کیں، خصوصاً اخیر کی ان چار آیات کے تجزیہ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ (۴) مستقل چیزیں قرآن کے اس تکوینی نظام ترسیل میں کارفرما ہیں:

۱......ایک حکیم وعلیم رب العالمین کی ماوراء کائنات مقدس ومنزہ ذات۔

۲......دوسرے نبی امی خاتم انبیاء ﷺ کی ذات معصوم مع جسدہ العنصری (جسم مادی کے ساتھ...... پہلی صورت میں- جبکہ جبرئیل امینؑ انسانی شکل میں آئیں...... آپ ﷺ کا قلب منور (روح شاعرہ) دوسری صورت میں- جبکہ جبرئیل امینؑ اپنی اصل ملکی صورت پر قائم رہیں۔

۳......تیسرے جبرئیل امینؑ قرآن کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لانے والے ملکی رسول، جن کا لقب ہی روح ہے۔

۴......قرآن مجید اللہ کا ازلی ابدی کلام۔

ان چاروں حقیقتوں کا مستقل اور خارجی وجود ایسا قطعی اور یقینی ہے کہ ان چاروں میں سے کسی ایک کے وجود خارجی کا انکار بھی ایسا ہے جیسے عین دوپہر کے وقت دھوپ میں کھڑا ہوا شخص سورج کے وجود کا اور اس کے ایک مستقل عامل خارجی ہونے کا انکار کرے اور کہے کہ یہ جو نظر آرہا ہے یہ تو محض ایک وہمی اور خیالی صورت ہے۔

علاوہ ازیں ارسال کا لفظ بھی ہر زبان میں چار حقیقتوں کے مستقل وجود خارجی کو چاہتا ہے، جن میں سے کسی ایک کے بھی نہ ہونے کی صورت میں ارسال کا مفہوم متحقق ہو ہی نہیں سکتا:

۱......ایک مرسل (بھیجنے والا)، ۲......مرسَل الیہ- جس کے پاس بھیجا ہے۔ ۳...... ما یرسل (وہ پیغام یا چیز جو بھیجی جائے۔ ۴......رسول (وہ شخص جس کے ذریعہ یا جس کے ہاتھ بھیجا جائے۔

ان میں سے آخری حقیقت کا وجود یقیناً ایک مستقل وجود خارجی اور عامل خارجی ہے، ان میں سے کسی ایک کے بھی مستقل وجود خارجی کا انکار درحقیقت اصل ارسال اور رسالت کا انکار ہے۔

درحقیقت قرآن کے مستقل وجود خارجی کا جبرئیلؑ کے وجود خارجی اور عامل خارجی ہونے کا انکار کرنے والے ہمارے مسلمان مستشرق قرآن کو (العیاذ باللہ) خود رسول اللہ ﷺ کا کلام کہنا چاہتے ہیں اور یہ مکلّف بھی صرف اس لئے ہیں کہ اپنے ''مخصوص مشن'' کے تحت وہ مسلمان کہلا کر مسلمانوں کو بے دین اور گمراہ کرنا چاہتے ہیں، ورنہ یہودی مستشرقین تو قرآن کو ''آپ ﷺ کا کلام'' بھی نہیں مانتے، بلکہ علانیہ اس زمانے کے یہودیوں اور عیسائیوں سے آسمانی تعلیمات کا استفادہ کر کے عربی زبان میں ڈھالی ہوئی کتاب کہتے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کا کارنامہ صرف عبرانی یا سریانی زبان سے عربی زبان اور عرب ذہنیت میں ڈھالنا قرار دیتے ہیں۔ (کتاب کے تیسرے باب ''قرآن یہودی اور عیسائی مستشرقین کی نظر میں'' کے تحت آپ مزید تفصیل پڑھیں گے)۔

قرآن مجید دنیا میں نازل ہونے سے پہلے کہاں تھا؟ اور پھر دنیا میں کب اور کس طرح آیا؟ اور اب تک کس صورت میں محفوظ ہے؟ اور قیامت تک کس طرح محفوظ رہے گا؟

قرآن مجید (اللہ کا ازلی، ابدی اور قدیم کلام) دراصل لوح محفوظ میں تھا اور ہے، جہاں نہ کسی انسان کی رسائی ہوسکتی ہے، نہ جن کی، نہ اذنِ خداوندی کے بغیر کسی فرشتہ کی۔ سورۃ البروج میں ارشاد ہے:

''بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ''. (البروج:۲۱،۲۲)

ترجمہ: ''بلکہ وہ (اللہ کا کلام) عظیم قرآن، لوح محفوظ میں ہے''۔

سورۃ الزخرف میں ارشاد ہے:

''وَإِنَّهُ فِيْ أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ''۔ (الزخرف:۴)

ترجمہ: ''اور بے شک وہ (قرآن) ام الکتاب (لوح محفوظ) میں ہمارے پاس ہے، بہت بلند تر ہے، نہایت محکم ہے''۔

لوح محفوظ کیا ہے؟

لوح محفوظ کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، عالم ملکوت کی چیز ہے، انسان (مادی مخلوق) اس کی حقیقت کو کیا جانے؟ تاہم قرآن مجید میں ہی حق جل وعلی شانہ کے ''لامحدود علم'' اور ''لامتناہی معلومات'' سے متعلق جو آیات وارد ہوئی ہیں، ان کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کا مصداق خدائے پاک وبرتر کے لامحدود اور تمام کائنات- گذشتہ، موجودہ اور آئندہ- پر محیط ''علم تفصیلی'' اور ''غیر متناہی تفصیلی'' معلومات کا وہ حصہ ہے جو اس نے کارکنان قضاء وقدر کر دیا ہے، اسی کا ''قدر ضروری حصہ'' قرآن مجید ہے، اسی لئے دوسری آیت کریمہ میں لوح محفوظ کو ''أم الکتاب''- اصل کتاب- سے تعبیر فرمایا ہے اور ''لدینا'' سے اس کا مقام متعین فرمایا ہے اور ''لعلی'' سے اس کی برتری اور رفعت کی اور ''حکیم'' سے اس کے محکم اور ناقابل تغیر وتبدل ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ ہم علم اور معلوماتِ الٰہی سے متعلق بطور ''گلے از گلزارے'' صرف دو آیات نقل کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ''علم'' اور ''معلومات الٰہی'' سے متعلق بڑی کثرت سے آیات موجود ہیں مراجعت کیجئے۔ (جاری ہے)

قرآن مجید کیا ہے؟

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ (۴)

علم سے متعلق سورۂ بقرۃ-آیۃ الکرسی قرآن کی عظیم ترین آیتوں میں سے ایک آیت-میں ارشاد ہے:

''وَلاَیُحِیْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ إِلاَّ بِمَا شَاءَ''. (البقرۃ:۲۵۵)

ترجمہ:-''اور وہ اس اللہ کے علم کی کسی بھی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے بجز اس کے جو وہ خود (بتلانا) چاہے''۔

اسی ''بِمَا شَاءَ'' کا مصداق قرآن مجید اور علوم وحی ہیں، یعنی قرآن مجید خود بھی ایک کتاب مبین ہے، مگر وہ بڑی کتاب-ام الکتاب-کا ایک حصہ ہے۔ معلوماتِ الٰہیہ سے متعلق سورۂ لقمان میں ارشاد ہے:

''وَلَوْ أَنَّ مَا فِیْ الأَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ أَقْلاَمٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمَاتُ اللّٰہِ إِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ''. (لقمان:۲۷)

ترجمہ:-''اور اگر (بالفرض) زمین میں جتنے درخت ہیں (ان کے) قلم ہوں اور سمندر اور اس کے بعد اس میں اضافہ ہو (اسی جیسے) سات سمندروں کا (سیاہی ہوں) اور ان لاتعداد قلموں اور سیاہی سے لکھے جائیں تب بھی اللہ کے کلمات (معلومات) نہیں ختم ہوں گے۔ بے شک اللہ بہت زبردست (علم کا مالک) حکمتوں والا ہے''۔

یہ معلومات الٰہیہ کی ''لامتناہی'' فراوانی کا اجمالی بیان ہے۔ اس کی کسی قدر تفصیل سورۂ انعام کی آیت ذیل میں بیان فرمائی ہے:

''وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لاَیَعْلَمُھَا إِلاَّ ھُوَ وَیَعْلَمُ مَا فِیْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَۃٍ إِلاَّ یَعْلَمُھَا وَلاَحَبَّۃٍ فِیْ ظُلُمَاتِ الأَرْضِ وَلاَ رَطْبٍ وَّلاَیَابِسٍ إِلاَّ فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ''۔ (الانعام:۵۹)

ترجمہ:۔''اور اللہ کے پاس غیب (کے خزانوں) کی کنجیاں ہیں، جن کو اس کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا اور جو کچھ بھی بر و بحر-خشکی اور تری- میں ہے سب کو وہ جانتا ہے اور (کسی بھی درخت کا) جو کوئی پتا جھڑتا ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے اور نہیں ہے زمین کی تاریک-آنکھوں سے اوجھل-تہوں میں کوئی بھی دانہ اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز، مگر وہ سب واضح (اور مفصل) کتاب میں لکھی ہوئی ہے''۔

اس آیت کریمہ میں ''کتاب مبین''-واضح اور مفصل کتاب-لوح محفوظ ہی کا دوسرا نام ہے، جو تمام کائنات کے اس علم تفصیلی اور معلوماتِ خداوندی پر محیط ہے، جس کو اس نے بقدر ضرورت ومصلحت بصورتِ کتاب منضبط کیا ہے اور اسی کتاب کا ایک حصہ قرآن مجید ہے۔''فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ''-لوح محفوظ میں-اور''فِيْ أُمِّ الْكِتَابِ''-ام کتاب میں-کی ظرفیت کا یہی مطلب ہے۔

قرآن مجید اللہ کا ازلی، ابدی اور قدیم کلام ہے

اللہ کا کلام بھی اللہ جل وعلیٰ کی ذات کی دیگر صفات کی طرح ازلی، ابدی اور قدیم ہے اور زمانی حدود وقیود-ماضی وحال ومستقبل-سے بالاتر اور وراء الوراء ہے۔ اللہ کی ذات اور جملہ صفات کی طرح اس اعلیٰ وارفع کا کلام بھی عقل انسانی کی دسترس سے قطعاً باہر ہے، نہ ہی حدوث وتجدد اور تغیر وتبدل اس میں راہ پا سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی مذکورہ بالا آیت کریمہ کا تیسرا فقرہ''وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ الخ''اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ''حوادثِ متجدّدہ'' یعنی دنیا میں نو بنو اور روز بروز پیش آنے والے واقعات وحالات -آج کل کی اصطلاح میں کہئے جدید حالات-کا بھی حق جل وعلیٰ کو روزِ ازل سے ہی علم ہے، یعنی اس کے علم کے اعتبار سے کوئی بھی چیز''نئی''نہیں ہے، جس کی بنا پر اس کے بنائے ہوئے قانون الٰہی میں کسی ترمیم واصلاح یا تغیر وتبدل کا سوال پیدا ہو، اسی لئے سورۃ الکہف میں ارشاد ہے:

''وَاتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَامُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهِ مُلْتَحَداً''۔ (الکہف:۲۷)

ترجمہ:۔''اور (اے نبی!) جو تیرے رب کی کتاب وحی کے ذریعہ تیرے پاس بھیجی گئی ہے، اس کی بے دھڑک لوگوں کے سامنے) تلاوت کرو (پڑھ کر سناؤ) اس کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا نہیں اور تو اس کے سوا کوئی بھی پناہ کی جگہ نہ پائے گا''۔

اس آیت کریمہ میں تو مُبَدِّل-تبدیلی کرنے والے-کی قطعی نفی کی گئی ہے اور سورۂ یونس میں ''تبدیلی'' کے امکان کی قطعی نفی کی گئی ہے، ارشاد ہے:

''لَاتَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ''(یونس) یعنی''اللہ کی باتوں کے بدلنے کا امکان نہیں''۔

اور سورۃ الفتح کی آیت کریمہ ذیل میں اعلان فرماتے ہیں کہ جو لوگ کلام اللہ-اللہ کی کسی بات

یا حکم- کو بدلنا چاہتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

''یُرِیْدُوْنَ أَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلاَمَ اللّٰہِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا کَذٰلِکُمْ قَالَ اللّٰہُ مِنْ قَبْلُ''۔ (الفتح:۱۵)

ترجمہ:۔''وہ (پیچھے رہنے والے منافق) چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام (حکم) کو بدل دیں تو (ان سے) کہہ دو: تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چلو گے، اسی طرح تمہارے متعلق کہہ دیا ہے اللہ نے پہلے سے''۔

اور تو اور خود صاحبِ الہام نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، کسی اور کی تو مجال کیا ہے کہ اللہ کے کلام -قرآن- اور احکامِ الٰہیہ میں تغیر وتبدل اور ترمیم وتصرف کا نام لے۔ سورۂ یونس میں ارشاد ہے:

''وَإِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ آیَاتُنَا بَیِّنَاتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لاَیَرْجُوْنَ لِقَاءَ نَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَیْرِ ھٰذَا أَوْ بَدِّلْہُ قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْ أَنْ أُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِیْ إِنْ اتَّبِعُ إِلاَّ مَا یُوْحٰی إِلَیَّ إِنِّیْ أَخَافُ إِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ''۔ (یونس:۱۵)

ترجمہ۔''اور جب ان (منکروں) کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جن کو ہم سے ملنے کا اندیشہ نہیں ہے، کہتے ہیں: ''اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اسی کو بدل دو'' تم کہہ دو! میری مجال نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کو بدل دوں، میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو وحی میرے پاس بھیجی گئی ہے، میں تو اگر اس کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن (روز قیامت) کے عذاب سے ڈرتا ہوں''۔

قرآن میں تغیر وتبدل کرنا بہت بڑا ظلم ہے

بہرحال اللہ جل وعلیٰ کی صفات ''علم'' اور ''قدرت'' وغیرہ کی طرح ''کلام'' بھی ازلی، ابدی اور قدیم ہے۔ اس میں تغیر وتبدل اور اصلاح وترمیم نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں، بلکہ بندوں کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی اور ظلم ہے۔ سورۂ ''ق'' میں ارشاد ہے:

"مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَا أَنَا بِظَلاَّمٍ لِّلْعَبِیْدِ". (ق:۲۹)

ترجمہ:۔''میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں (اپنے) بندوں کے حق میں ناانصاف مطلق نہیں ہوں''۔

اس آیت کریمہ میں "لـــدیّ" -میرے ہاں- خاص طور پر قابل غور ہے، یعنی جب اللہ جل وعلیٰ کا کلام- احکام اور فیصلے سب کے سب- لامحدود علم وحکمت اور کامل قدرتِ تدبیر وتصرف یعنی انصاف پر مبنی ہیں تو ایسی صورت میں بفرضِ محال جو بھی تغیر وتبدل، ترمیم واصلاح کی جائے گی یقیناً وہ علم وحکمت

کے خلاف اور بندوں کے ساتھ سراسر ناانصافی اور ظلم ہوگی، اس لئے کہ اللہ جل شانہٗ کا کلمہ - فیصلہ - سچائی اور عدل وانصاف پر مبنی ہے، اس کا خلاف یقیناً جھوٹ اور ظلم ہوگا، سورۂ انعام میں ارشاد ہے:

''وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقاً وَّعَدْلاً لاَمُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ''. (الأنعام:۱۱۵)

ترجمہ:۔''تیرے رب کا کلمہ سچائی اور عدل (وانصاف) کے اعتبار سے پورا (اور کامل) ہو چکا (اب) اس کے کلمات میں کوئی بھی تبدیلی کرنے والا نہیں (ہوسکتا) بے شک وہ خوب سننے اور خوب جاننے والا ہے''۔

بہرصورت قرآن کریم کی تصریحات اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قرآن مجید، لوح محفوظ اور ام الکتاب سے بیت المعمور - آسمانی کعبہ - کے ایک حصہ میں جس کا نام بیت العزت ہے، ایک کتاب کی صورت میں اللہ جل وعلیٰ نے منتقل فرمایا، سورۂ طور میں ارشاد ہے:

''وَالطُّوْرِ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَّالَهٗ مِنْ دَافِعٍ''۔ (الطّور:۱تا۸)

ترجمہ:۔''قسم ہے (کوہ) طور کی اور (وصلی کے) طویل وعریض ورقوں میں لکھی ہوئی کتاب کی اور سدا آباد گھر کی اور (زمین کی) بلند چھت (آسمان اول) کی اور طوفان خیز سمندر کی کہ تیرے پروردگار کا عذاب ضرور واقع ہوگا اور کوئی بھی اس کو روک نہیں سکتا''۔

اس آیت کریمہ میں اللہ جل وعلیٰ نے پانچ عظیم مظاہر قدرت الٰہیہ کی قسم کھائی ہے، جن کی تشریح یہ ہے:

''الطور'' کوہ طور ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلاواسطہ پردہ کے پیچھے سے کلام فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں اس کلام کا تفصیلی بیان متعدد سورتوں میں مفصل مذکور ہے۔ اسی کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست ''رَبِّ أَرِنِيْ أَنْظُرْ إِلَيْكَ'' - اے میرے رب! تو خود کو مجھے دکھلا دے، میں تیری طرف دیکھوں گا - کے جواب میں حق جل وعلیٰ نے رؤیت (دیدار) کے بجائے اپنی ایک تجلی - جلوہ - کا اسی کوہِ طور پر اظہار فرمایا ہے، جس کے نتیجہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہوکر گر پڑے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور ہوش میں آنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے مشتاقانہ اصرار سے توبہ کی ہے، تفصیل کے لئے سورۂ اعراف ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ جل وعلیٰ کی رؤیت کی طرح اُس سے کلام بھی براہِ راست اور رودررو کسی مادی مخلوق کے لئے ناقابل برداشت ہے، چنانچہ سورۂ حشر کے رکوع:۳ میں ارشاد ہے:

''لَوْأَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهٗ خَاشِعاً مُّتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ''۔ (الحشر:۲۱)

ترجمہ:۔''اگر (بالفرض) ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتار دیتے تو تو دیکھ لیتا کہ وہ اللہ کے خوف سے جھک جاتا، پھٹ جاتا اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ (حقائق الٰہیہ کو) سوچیں اور سمجھیں''۔

اور یہی ہے اس قرآن کا وہ لاہوتی ثقل- گرانی اور شدت- جس سے اللہ جل وعلیٰ نے نزولِ قرآن شروع ہونے کے بعد کی دوسری ہی سورت سورۂ مزمل میں اپنے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو بھی اور آپ ﷺ کی امت کو بھی آگاہ اور خبردار کیا ہے کہ وہ نزول قرآن کے وقت قرآن کے خارق العادۃ -خلاف عادت اور غیر معمولی- حال سے بے حال کر دینے والی گرانی سے گھبرا نہ جائیں یا اس کیفیت کو کوئی مرض-مرگی کا دورہ، وغیرہ- نہ سمجھ بیٹھیں، ارشاد ہے:

''إِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلاً ثَقِيْلاً''. (المزمل:۵)

ترجمہ:۔''بے شک ہم تجھ پر (فرشتہ کے واسطے سے) ایک بھاری کلام القاء کریں گے''۔

''کتاب مسطور'' قرآن مجید ہے جو وصلی- باریک جھلی- کے کشادہ اور طویل وعریض اوراق میں لکھا گیا ہے۔

''البیت المعمور''- آباد گھر- وہ آسمانی کعبہ ہے جو زمینی کعبہ کی بالکل محاذات میں ہے اور ہر وقت طواف کرنے والے فرشتوں سے بھرا ہوا اور آباد رہتا ہے۔

''السقف المرفوع''- بلند چھت- پہلا آسمان ہے جو ہر سمت سے اس روئے زمین کی چھت کے مانند ہے، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔ روایات اور احادیث سے اس اجمال کی تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ سقفِ مرفوع -آسمان اول- پر ہی بیت المعمور ہے اور اسی کے کسی حصہ میں یا اس کے آس پاس بیت العزت ہے، جس میں پورا کا پورا لکھا ہوا قرآن رکھا گیا ہے۔''ان لکھنے والوں کا'' اور اس ''قلم الٰہی'' کا جس سے ام الکتاب- لوح محفوظ- اور قرآن لکھا گیا ہے اور ''لکھنے'' کا ذکر سورۂ قلم میں اور سورۂ عبس میں موجود ہے۔ سورۃ القلم میں ارشاد ہے:

''وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ مَا أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ''۔ (القلم:۱،۲)

ترجمہ:۔''قسم ہے قلم کی اور (فرشتوں کے) لکھنے کی کہ تو اپنے رب کے فضل وانعام سے پاگل ہرگز نہیں ہے''۔

سورۂ عبس میں ارشاد ہے:

''كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِأَيْدِىْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ''۔ (عبس:۱۱،۱۲،۱۳،۱۴،۱۵،۱۶)

ترجمہ:۔''ایسا نہیں ہے (کہ تم لوگوں کے پیچھے پڑو) بے شک یہ تو ایک نصیحت (کی

کتاب) ہے، پس جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرلے، لائق احترام بلند و برتر پاک پاکیزہ صحیفوں میں (لکھی ہوئی) بڑے رتبے والے نیک طینت لکھنے والوں کے ہاتھوں سے''۔

''**صحف مکرمة**'' سے مراد قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ اسی طرح سورۃ البینۃ میں حسبِ ذیل الفاظ میں خبر دی ہے:

''**رَسُوْلٌ مِّنَ اللهِ يَتْلُوْا صُحُفاً مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ**''. (البینۃ:۲،۳)

ترجمہ:۔''اللہ کا رسول جو پڑھ کر سناتا ہے، (باطل سے) پاک و پاکیزہ صحیفے جن میں محکم لکھے ہوئے مقیاس ہیں''۔

اس لئے کہ ہر سورت ایک مستقل صحیفہ-آسمانی کتاب- ہے اور یہ تمام صحیفے -سورتیں- خدائے پاک و برتر کا کلام ہونے کی بنا پر''لائق احترام'' اور رفعتِ مکان کے اعتبار سے''بلند و برتر'' اور باطل کی آمیزش سے ''پاک و پاکیزہ'' ہیں۔ ان کے لکھنے والے فرشتے بھی ملکوتی اور نوری مخلوق ہونے کی بنا پر''بڑے رتبے والے'' اور''نیک طینت'' ہیں، ان سے ذرہ برابر حکم الٰہی کی تعمیل لکھنے میں غلطی یا کوتاہی کا امکان ہے ہی نہیں۔

آسمان پر پورا قرآن کس تاریخ کو اترا؟

قرآن مجید حق جل وعلیٰ نے کتابی شکل میں لوح محفوظ سے آسمان اول پر ماہِ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب لیلۃ القدر میں اتارا ہے، ارشاد ہے:

۱......''**شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ**''. (البقرۃ:۱۸۵)

ترجمہ:۔''رمضان کا مہینہ وہ مبارک مہینہ ہے، جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کی ہدایت کے لئے''۔

۲......''**إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِیْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ**''. (القدر:۱)

ترجمہ:۔''بے شک ہم ہی نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا''۔

۳:......''**إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِیْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ**''. (الدخان:۳)

ترجمہ:۔''بے شک ہم ہی نے اس (قرآن) کو اتارا ہے ایک برکت والی رات (لیلۃ القدر) میں، اس لئے کہ ہم (اپنے بندوں کو) خبردار کردینے والے ہیں''۔

محققین مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس''**لیلة مبارکة**'' سے لیلۃ القدر ہی مراد ہے، جیسا کہ سورۂ لیلۃ القدر میں تصریح ہے۔

(جاری ہے)

قرآن مجید کیا ہے؟

(آخری قسط) حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ

اوّل سے قرآن مجید کس طرح اتارا؟

یہ نزولِ قرآن مجید کا پہلا مرحلہ ہے، یعنی لوحِ محفوظ سے پورے کے پورے قرآن مجید کا نزول سماءِ دنیا پر، جس کی تصریح قطعی طور پر مذکورہ آیات میں موجود ہے۔ سماءِ دنیا سے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قرآن مجید کا نزول ''جملةً واحدةً'' - پوری کتاب کی صورت میں ایک ہی دفعہ- ہو، یا ''نَجماًنَجماً'' -تھوڑا تھوڑا- قرآن مجید اس کا جواب بھی دیتا ہے اور اس کی حکمت ومصلحت بھی بیان کرتا ہے۔

کفار کے مطالبے

''وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلاَ أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً''. (الفرقان:۳۲)

ترجمہ:......''اور کافروں نے کہا کیوں نہیں اتارا گیا اس پر قرآن سارا کا سارا ایک دفعہ؟''۔

(اس) کے جواب میں ارشاد ہے:

''وَكَذٰلِكَ، لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلاً وَلاَيَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيْرًا''۔ (الفرقان:۳۲)

ترجمہ:......''اور وہاں اسی طرح اتارا ہے، تاکہ اس سے ہم تیرے دل کو مضبوط رکھیں، (وقتاً فوقتاً) آیات قرآن کے نزول سے تقویت قلب ہوتی رہے اور تھوڑا تھوڑا پڑھ کر سنایا ہے (تاکہ تو گھبرا نہ جائے کہ اتنی بڑی کتاب کو کیسے از بر یاد رکھوں؟) اور (بڑا فائدہ یہ ہے کہ) وہ کفار تمہارے پاس انوکھی بات لائیں، ہم (اس کے جواب میں) حق بات اور (اس کی) بہتر تفسیر پہنچا دیں''۔

یہ فائدہ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی سے متعلق ہے اور بے حد اہم ہے۔ باقی عام امت (صحابہؓ) کے لئے بھی یہی بہتر تھا کہ قرآن تھوڑا تھوڑا اتارا جائے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

’’وَقُرْآناً فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلٰی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ وَّنَزَّلْنَاهُ تَنْزِیْلاً‘‘۔(بنی اسرائیل:۱۰۶)

ترجمہ:......’’اور قرآن کو ہم نے جدا جدا (کرکے نازل) کیا، تاکہ تم اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھو (اور وہ تھوڑا تھوڑا یاد کرتے رہیں) اور ہم نے اس قرآن کو اتارتے اتارا ہے‘‘۔

اگر قرآن مجید یکدم پورا کا پورا کتابی شکل میں نازل کردیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ ایک ایسی قوم کے لئے جو ایمان لانے سے پہلے لکھنے پڑھنے سے ناآشنا اور اُمی ہے اور پابندیٔ احکام اس کی افتادِ طبع کے خلاف ہے، اس پوری کی پوری ضخیم کتاب کو یاد کرنا دشوار تھا، بلکہ ان گوناگوں اور انسانی زندگی پر محیط احکام واعمال پر عمل کرنا اس سے بدرجہا زیادہ دشوار اور ناقابل عمل تھا۔ اللہ جل شانہٗ روزِ ازل سے اس حقیقت کو جانتے تھے، اس لئے لوح محفوظ سے تو پورا کا پورا قرآن کتابی شکل میں نازل فرمادیا، تاکہ اس کو’’کتاب آسمانی‘‘ کہا جاسکے اور نازل شدہ آیات کو اس کتاب مبین-قرآن مجید- کا حصہ بتلایا جاسکے۔ لہٰذا یہ قرآن مجید اللہ جلت حکمتہ نے رسول اللہ ﷺ اور امت پر حسبِ مصلحت وضرورت تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا، ارشاد ہے:

۱......’’تَنْزِیْلُ الْکِتَابِ مِنَ اللهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ‘‘. (المؤمن:۲)

ترجمہ:......’’اس کتاب کو تھوڑا تھوڑا اتارا، غالب و برتر، بڑے علم والے اللہ کی جانب سے ہے‘‘۔

۲......’’تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کِتَابٌ فُصِّلَتْ آیَاتُهُ قُرْآناً عَرَبِیّاً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ‘‘. (حم السجدۃ:۲،۳)

ترجمہ:......’’بڑے ہی رحم والے مہربان خدا کی جانب سے جو تھوڑی تھوڑی نازل ہو رہی ہے، وہ ایک کتاب ہے، جس کی آیتیں جدا جدا کی ہوئی ہیں، قرآن ہے عربی (زبان) میں ایسے لوگوں کے لئے جو (عربی زبان کو خوب اچھی طرح) جانتے ہیں‘‘۔

قرآن کی آسمان سے زمین پر سب سے پہلے کون سی آیات نازل ہوئیں اور کس تاریخ کو؟

قرآن کریم کے رسول اللہ ﷺ پر اترنے کے سلسلہ میں لفظ’’تعلیم‘‘ اور’’قراءت‘‘ کی تفصیل قرآن عظیم کی تصریحات کی روشنی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ دونوں لفظ اور ان سے ماخوذ الفاظ (مشتقات) خصوصاً لفظ’’قراءت‘‘ -پڑھانا- قطعی طور پر ثابت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کو پڑھانے والا اس طرح پڑھاتا ہے، جیسے ایک انسان پڑھاتا ہے اور آپ ﷺ بالکل اس طرح پڑھتے ہیں، جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے پڑھتا ہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام انسانی شکل میں آکر پڑھاتے ہیں۔ اس سلسلہ کی پانچ آیات حسبِ ذیل ہیں:

’’إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، إِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْأَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ‘‘۔ (العلق:۱،۲،۳،۴،۵)

ترجمہ:...... ’’پڑھو! اپنے رب کے نام سے جس نے (سب کچھ) پیدا کیا ہے۔ انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا ہے۔ پڑھو! اور تمہارا رب سب سے بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے (لکھنا) سکھلایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھلایا جو وہ نہیں جانتا تھا‘‘۔

سورۂ علق کی ان پانچ آیات کے متعلق نہ صرف یہ کہ امت مسلمہ کے ہر خاص وعام، عالم وجاہل کا حد تواتر تک پہنچا ہوا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام سب سے پہلے ’’سورۂ اقرأ‘‘ کی (عوام میں یہ سورت اسی نام سے معروف ہے) آیات لے کر آئے ہیں، بلکہ ان آیات میں لفظ ’’إِقْــــرَأْ‘‘ اور اس کا تکرار بھی اس پر شاہد ہے کہ قرآن کی پڑھائی کی بسم اللہ (ابتداء) انہی آیات سے ہوئی ہے، چنانچہ امت محمدیہ کے معلّمین اور حفاظ آج تک اسی سنت الٰہیہ کے تحت اسی طرح پڑھائی شروع کراتے ہیں: پڑھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم، پڑھو: الف، با، تا، ثا۔ یاد رکھئے! کسی قوم کی ’’قومی روایات‘‘ علم نفسیات کی رو سے قطعی اور دعوے کا ناقابل تردید ثبوت ہوا کرتی ہیں۔

ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل مطابق ۵۷۲ میلادی ۱۲ یا ۸ ماہ ربیع الاول کو مکہ مکرمہ میں ہوئی ہے اور آپ ﷺ کی عمر کے پورے چالیسویں سال آپ ﷺ پر غار حرا سے نکلتے ہوئے سب سے پہلی وحی نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا ’۱۲ر یا ۸ر ربیع الاول عام البعثت زمین پر نزولِ قرآن کے آغاز کی تاریخ ہے، اور سورۂ علق کی مذکورہ بالا آیات قرآن کی زمین پر نازل شدہ سب سے پہلی پانچ آیات ہیں، گویا اسی سال ماہ رمضان المبارک کی لیلۃ القدر کو پورا قرآن لوحِ محفوظ سے آسمان پر کتابی شکل میں اترا (جیسا کہ قرآن کی تصریحات کی روشنی میں آپ پڑھ چکے ہیں)

زمین پر پورا قرآن کتنے عرصہ میں اترا؟

اور تقریباً ساڑھے بائیس سال میں رفتہ رفتہ تدریجی طور پر پورا قرآن زمین پر اترا، اس لئے کہ قرآن کریم کی آخری آیت حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ھ میں حسب ذیل نازل ہوئی، اللہ جلت نعماءہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

’’اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْإِسْلاَمَ دِیْنًا‘‘۔ (المائدۃ:۳)

ترجمہ:...... ’’آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لئے اسلام کو دین ہونے کے اعتبار سے پسندیدہ قرار دے دیا‘‘۔

اس آیت کریمہ میں کلمہ ’’اَلْیَــــوْمَ‘‘ (آج) قطعی طور پر دن کی تعیین کررہا ہے اور وہ دن تاریخی اعتبار سے ۱۰؍ذوالحجہ، ۱۰ہجری ہے اور یہی آیت کریمہ وحی قرآنی کے انقطاع کا اعلان بھی ہے، اس لئے کہ اکمالِ دین اور تتمیمِ نعمت کے بعد اضافہ کا امکان ہی نہیں رہتا، چنانچہ آپ ﷺ اس کے بعد تقریباً ۸۲؍دن بقید حیات رہے، اس عرصہ میں احکام سے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، تاآنکہ ۱۲؍یا ۱۰؍ربیع الاول ۱۱ ہجری کو عالم فنا سے عالم بقا کی طرف رحلت فرماگئے، إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اور ’’یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ‘‘ کی دعوت الٰہی پر لبیک فرماکر ’’فِيْ عِبَادِيْ‘‘ (ملأ اعلیٰ) اور ’’فِيْ جَنَّتِيْ‘‘ میں داخل ہوگئے۔

قرآن اللہ کی ایسی کتاب آسمانی ہے جس میں نہ باطل کسی طرح راہ پاسکتا ہے، نہ ہی کسی شک وشبہ کی اس میں گنجائش ہے۔

قرآن مجید اللہ کی ایسی محکم کتاب ہے کہ اس کتاب کے تغیر وتبدل اور مسخ وتحریف سے ’’محفوظ‘‘ ہونے اور ’’باطل کے اس میں کسی بھی طرح راہ نہ پاسکنے‘‘ کے متعلق خود اللہ جل جلالہٗ ضمانت دے رہے ہیں، ارشاد ہے:

’’وَإِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَّايَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ، تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ‘‘۔ (حم السجدة:۴۱،۴۲)

ترجمہ:......’’اور بے شک وہ قرآن ایک زبردست کتاب ہے، باطل اس کتاب میں نہ اس کے آگے سے راہ پاسکتا ہے، نہ پیچھے سے (اس لئے کہ) وہ ایک بڑی حکمتوں والے لائق ستائش (پروردگار) کی تدریجاً اتاری ہوئی (کتاب) ہے‘‘۔

اس کتاب میں کسی بھی قسم کی کوئی کجی یعنی نقص وعیب نہیں ہے، ہر پہلو سے محکم ہے، ارشاد ہے:

’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا‘‘۔ (الکہف:۱)

ترجمہ:......’’سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر کتاب اتاردی، اس میں کسی بھی قسم کی کجی نہیں‘‘۔

اگر یہ کتاب، عزیز وحکیم اللہ کے علاوہ کسی بھی اور کی ہوتی تو اس میں الفاظ، معانی اور مضامین کے اعتبار سے بکثرت اختلاف، تفاوت اور تضاد ضرور پایا جاتا، چنانچہ یہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ بڑے سے بڑے قادر الکلام انسان کا اتنا مبسوط کلام (کتاب) اس نقص وعیب سے کبھی پاک اور مبرا نہیں ہوتا، حتیٰ کہ افصح العرب والعجم اور ’’أوتیت جوامع الکلم‘‘ کے مالک نبی عربی ﷺ کے کلام (احادیث) میں اختلاف تو پایا ہی جاتا ہے، جو اگرچہ مصالح شرعیہ پر مبنی ہے، لیکن بہرحال ہے، اس لئے محدثینؒ نے علوم حدیث میں ’’علم المختلف والمؤتلف‘‘ ایک مستقل علم مدون کیا ہے، جس میں اختلافِ احادیث کے وجوہ ومحامل بیان کئے ہیں اور اصولِ تطبیق وضع کئے ہیں اور منکرین حدیث تو اسی اختلاف کو تضاد کہہ کر انکار احادیث کے درپے

ہیں۔ بہرحال یہ کتاب الٰہی قرآن مجید اس نقص وعیب سے بالکل پاک اور مبرا ہے، ارشاد ہے:

''أَفَلاَ يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْكَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلاَفًا كَثِيْرًا''۔ (النساء:۸۲)

ترجمہ: ......''کیا یہ منکرین قرآن میں غور نہیں کرتے (کہ ان پر اس کا کلام اللہ ہونا واضح ہو) اور اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو وہ اس میں کثرت سے اختلاف اور تفاوت محسوس کرتے''۔

اسی لئے ارشاد ہے:

''الٓم تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ لاَرَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ''. (الم سجدۃ:۱،۲)

ترجمہ: ......''الف، لام، میم، اس کتاب کو تدریجاً اتارنا، اس میں مطلق شک وشبہ نہیں کہ رب العالمین کی جانب سے ہے''۔

قرآن عربی زبان میں کیوں اتارا گیا؟

اس کتاب عزیز (قرآن مجید) کی زبان علیم وحکیم پروردگار نے فصیح عربی اس لئے تجویز کی ہے کہ اس کے اولین مخاطب فصحاء وبلغاء عرب ہیں، وہ بآسانی اس کتاب کے انسانی قدرت سے ماوراء ہونے کو سمجھ سکیں گے اور ان کا فیصلہ تمام نوع انسانی کے واسطے حجت اور قابل قبول ہوگا، ارشاد ہے:

''حٰمٓ وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ''۔(الزخرف:۱،۲،۳)

ترجمہ: ......''حا، میم! قسم ہے فصیح (وبلیغ) کتاب کی، بے شک ہم نے اس کو عربی (زبان کا) قرآن تجویز کیا ہے، تاکہ تم (اے اہل عرب!) اس کو سمجھو (کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے)''۔

قرآن کی مخاطب ومکلّف تمام نوعِ انسانی ہے

اس لئے کہ قرآن صرف عرب کے لئے نہیں، بلکہ پوری نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے اتارا گیا ہے، ارشاد ہے:

ا......''وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا''۔(الشوریٰ:۷)

ترجمہ: ......''اور اسی طرح ہم نے (بطور) وحی بھیجا آپ کے پاس عربی قرآن، تاکہ تم (قہر خداوندی سے باخبر ہوکر) بستیوں کی اصل (مکہ) اور اس کے اردگرد بسنے والی تمام دنیا کے لوگوں کو ڈراؤ''۔

۲......"الٓرٰ تِلْکَ آیَاتُ الْکِتَابِ الْمُبِیْنِ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ". (یوسف:۱،۲)

ترجمہ:......"الف، لام، را، یہ واضح (اور روشن) کتاب کی آیتیں ہیں، بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن اتارا ہے، تاکہ تم سمجھ لو"۔

چنانچہ حق پسند زعماء عرب نے صاف اقرار کیا:

"مَاهٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ"۔ یعنی "یہ انسان کا قول ہرگز نہیں"۔

اور جن معاندین (حق سے عناد رکھنے والے اور جان بوجھ کر انکار کرنے والے لوگوں) نے حق جاننے کے باوجود قرآن کو خدا کا کلام ماننے سے انکار کیا اور کہا:

"إِنْ هٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ"۔ "نہیں ہے یہ مگر انسان کا قول"۔

اُن کو تفصیلی طور پر ہر ہر اعتراض کا جواب بھی دیا، جس کی تفصیل آپ عنقریب پڑھیں گے اور آخر میں چیلنج کیا جو آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ مکی سورت سورۂ یونس میں ارشاد ہے:

"قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ"۔ (یونس:۳۸)

ترجمہ:......"(اے نبی!) تم کہہ دو: پس تم اس (قرآن) جیسی ایک سورت ہی لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جن (طاغوتی طاقتوں) کو تم (اپنی مدد کے لئے) بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو"۔

قرآن کے عربی زبان میں نازل ہونے کی دوسری وجہ

علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ جن پر قرآن نازل کیا جارہا ہے، وہ بھی عربی النسل ہیں اور عادت الٰہیہ یہ رہی کہ ہر رسول اور اس کی کتاب کی زبان وہی ہوتی ہے جو اس کی قوم کی ہوتی ہے، ارشاد ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ"۔ (ابراہیم:۴)

ترجمہ:......"ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے وہ اپنی قوم کی ہی زبان والا ہے، تاکہ وہ ان کو (ان کی ہی زبان میں) اچھی طرح اللہ کا پیغام سمجھائے"۔

قرآن مجید کی عظمت اور اس کے مستقل وجودِ خارجی کے دلائل

اللہ جلت حکمته نے اپنے اس کلام قرآن مجید میں متعدد سورتوں اور آیتوں میں خود اس قرآن مجید کی قسمیں کھائی ہیں اور قرآن وعلوم قرآن میں بصیرت رکھنے والے اربابِ علم جانتے ہیں کہ

سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ جلت عظمتہ اپنے اس کلام الٰہی میں ہمیشہ اپنے ان عظیم ترین مظاہر قدرت کی قسمیں کھاتے ہیں جو مابعد بیان کئے گئے دعوے کی روشن اور قطعی دلیل ہوتے ہیں، تاکہ ''دعوٰی الشئ مع بیّنة وبرھان '' (دعویٰ مع ثبوت ودلیل) اور '' آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کا مصداق ہوجائے اور کسی منکر کو ان مظاہر قدرت کے مشاہدہ اور معائنہ کے بعد آئندہ بیان اور دعوے کے انکار کی گنجائش نہ رہے۔ لہٰذا مذکورۃ الصدر آیات میں قرآن مجید کی قسم، قرآن کے مستقل وجود اور عظیم ترین مظہرِ قدرت الٰہی ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ چند ایسی آیات ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں، سورۂ ''ص'' میں ارشاد ہے:

۱......''صٓ وَالْقُرْآنِ ذِیْ الذِّکْرِ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ''۔(ص:۱،۲)

ترجمہ:......''ص، قسم ہے اس نصیحت (کرنے) والے قرآن کی (یہ بے شک وشبہ برحق ہے) بلکہ انکار کرنے والے حمیت ونخوت اور (اس کی) مخالفت وعداوت میں (گرفتار) ہیں''۔

۲......''یٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَکِیْمِ إِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ، عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ، تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ''۔ (یٰس:۱،۲،۳،۴،۵)

ترجمہ:......''یٰس، قسم ہے اس محکم قرآن کی، بے شک تم بھیجے ہوئے (نبیوں اور رسولوں) میں سے ہو، سیدھے راستہ پر قائم ہو، یہ قرآن حکیم ہی اس کی دلیل ہے، یہ قرآن بڑے زبردست مہربان (خدا) کا نازل کردہ ہے''۔

ان آیات کے علاوہ سورۂ زخرف، سورۂ دخان، سورۂ ق، سورۂ طور کی ابتدائی آیات میں ان قرآن کی قسموں کا ذکر آپ پڑھ چکے ہیں۔ اسی طرح اللہ جلت حکمتہ نے قرآن کریم کے اللہ کا کلام اور آسمانی کتاب ہونے کے ثبوت اور دلیل کے طور پر اپنے اہم ترین مظاہر قدرت کی قسمیں کھائی ہیں، چنانچہ سورۃ التکویر میں ارشاد ہے:

''فَلاَأُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْکُنَّسِ وَاللَّیْلِ إِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ إِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ''۔ (التکویر:۱۵،۱۶،۱۷،۱۸)

ترجمہ:......''پس (ایسا) نہیں (جیسا تم سمجھتے اور کہتے ہو) میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے، چلتے رہنے والے، چھپ جانے والے (ستاروں) کی اور رات کی جب وہ چھپ جائے اور صبح کی جب وہ سانس لے (صبح صادق کا وقت نمودار ہو) کہ بے شک یہ (قرآن) ایک معزز فرستادہ (فرشتہ) کا قول ہے (آخر آیت تک جو آپ پڑھ چکے ہیں)''۔

دیکھئے! اس آیت کریمہ میں انسانی دسترس بلکہ قطعی اور یقینی فہم وادراک سے بھی بالاتر نظامِ سیارات اور نظامِ شمسی سے ظہور پذیر ہونے والے صبح وشام اور روز وشب کے نظام کو قرآن کے لوحِ محفوظ سے رسول بشری تک نظامِ ترسیل کے دعوے پر بطور دلیل وبرہان پیش کیا ہے کہ جیسے یہ نظام انسانی دسترس بلکہ فہم وادراک سے بالاتر اور اللہ جلت قدرتہ وحکمتہ کی تکوینی تدابیر کے تحت چل رہا ہے،

بالکل اسی طرح قرآن کا نظام ترسیل وارسال بھی اسی علیم وحکیم خالق کائنات کی تکوینی تدابیر کے تحت وقوع پذیر ہوتا ہے، نہ تم اس نظام کی حقیقت کو کما حقہ سمجھ سکتے ہو۔تمہارے ایمان واسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم خالق کائنات کے بیان پر ''آمنا وصدقنا'' کہو، یہی راسخین فی العلم کی شان ہے، ارشاد ہے:

''وَالرَّاسِخُوْنَ فِيْ الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا''۔ (آل عمران:۷)

ترجمہ:......''اور پختہ ومحکم علم والے کہتے ہیں: ہم تو اس (قرآن) پر ایمان لاچکے، سب ہمارے رب کی جانب سے ہے (چاہے ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے)''۔

ان آیاتِ قرآنیہ میں تو راسخین فی العلم کا مقتضاء ایمان بیان فرمایا ہے۔تحریف وتاویل کے درپے ہونے والے زائغین کا طریق کار اس سے بالکل مختلف ہے، ارشاد ہے:

''فَأَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيْلِهٖ وَمَايَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗ إِلَّا اللّٰهُ''۔ (آل عمران:۷)

ترجمہ:......''باقی وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی (اور گمراہی) ہے، پس وہ لوگ تو قرآن کی متشابہ آیات (جن کی مراد کی تعیین انسانی عقل وفہم سے باہر ہے) ہی کے پیچھے پڑتے ہیں، فتنہ (پھیلانے) کی غرض سے اور مراد متعین کرنے کی غرض سے، حالاں کہ ان کی حقیقی اور قطعی مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔

قرآن مجید کے مستقل وجود خارجی کی ایک اور دلیل

قرآن کریم میں قرآن کے متعلق تعلیم اور قراءت اور ان کے مشتقات کے علاوہ بکثرت لفظ نزول اور اس سے مشتق (ماخوذ) افعال اور مصادر استعمال ہوئے ہیں۔اس کلمہ کے مفہوم میں ''اوپر سے نیچے آنے'' کے معنی جوہری طور پر داخل ہیں، جس کو اردو میں ''اترنا'' کہتے ہیں اور عربی میں ''نزول'' کہتے ہیں۔ جو نمایاں فرق اردو میں اترنے اور آنے میں ہے، بعینہٖ وہی فرق عربی میں ''اتیان'' یا ''مجیء'' اور ''نزول'' میں ہے۔جیسے اردو میں اترنا اور اس سے مشتق افعال ''لازمی'' ہیں، یعنی صرف ایک ذات (فاعل) سے وقوع میں آجاتے ہیں، لیکن اگر کسی اور ذات یا چیز کو اوپر سے نیچے لایا جائے تو اس کے لئے ''اتارنا'' اور اس سے مشتق افعالِ متعدی استعمال ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح عربی میں کسی اور ذات یا چیز کو اوپر سے نیچے اتارا جائے تو اس کے لئے ''إنزال''، ''تنزیل'' اور ان سے مشتق افعال استعمال ہوتے ہیں یا فعل لازم ''نزل'' پر ''بہ'' کا اضافہ کرکے اُسے متعدی بنالیا جاتا ہے اور اس صورت میں اس کے تحقق اور وقوع میں آنے کے لئے اس ذات یا چیز کا مستقل وجود قطعی طور پر ضروری ہوتا ہے جس کو اتارا ہے۔اب آپ قرآن مجید کے متعلق اس کلمے، افعال، مصادر اور مشتقات کا جائزہ لیجئے، قرآن کے متعلق تنہا ''نزول''، یعنی فعل لازم قطعاً استعمال نہیں ہوا،

بلکہ یا ’’بہ‘‘ کے اضافہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جیسا کہ آپ ’’نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الأَمِيْنُ‘‘ سورۃ الشعراء کی آیات میں پڑھ چکے ہیں یا مصدر ’’إنزال‘‘ سے مشتق فعل استعمال ہوا ہے، جیسا کہ آپ ’’إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ‘‘ سورۂ لیلۃ القدر میں پڑھ چکے ہیں یا مصدر ’’تنزیل‘‘ جیسا کہ آپ سورۃ الشعراء کی آیت میں پڑھ چکے ’’وَإِنَّهُ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ‘‘ یا اس ’’تنزیل‘‘ سے متعلق فعل ’’نَزَّلَهُ‘‘ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ’’فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ‘‘ میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اسی طرح اس اتارنے کے معنی کے متحقق ہونے کے لئے جہتِ فوق ’’اوپر‘‘ ہونا چاہئے، جہاں سے اتارا، جیسا کہ آپ سورۂ بروج میں قرآن کے لئے ’’فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ‘‘ اور سورۂ زخرف ’’وَإِنَّهُ فِيْ أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا‘‘ میں پڑھ چکے۔ اور ایک جہت تحت ’’نیچے‘‘ ہونا چاہئے، جہاں اتارا، جیسا کہ آپ قرآن کے متعلق ’’عَلٰى قَلْبِكَ‘‘ سورۂ شعراء اور سورۂ بقرہ میں پڑھ چکے، گویا اللہ جل جلالہٗ نے قرآن کے متعلق مذکورہ ذیل سوالات کے جوابات دے دیئے ہیں:

۱…… کس نے اتارا؟ جواب: جبرئیل امین علیہ السلام نے۔

۲…… کیا اتارا؟ جواب: قرآن مجید۔۔

۳…… کہاں سے اتارا؟ جواب: لوح محفوظ سے، پھر آسمانِ اول سے۔

۴…… کہاں اتارا؟ جواب: رسول اللہ ﷺ کے قلب پر۔

۵…… کس کے حکم سے؟ جواب: اللہ کے حکم سے۔

ان پانچوں حقیقتوں کا مستقل وجودِ خارجی ہے، خصوصاً جبرئیل امین علیہ السلام اور قرآن کہ یہ دونوں تو ایسے قوی عامل اور مؤثر خارجی ہیں کہ ان کے مستقل وجود کا انکار کر دینے کے بعد تو قرآن کے اترنے اور اتارنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہنا کہ ’’قرآن مجید پورا کا پورا کلام اللہ بھی ہے اور اسی طرح پورا محمد ﷺ کا کلام ہی ہے‘‘۔ یہ تو استشراقی فکر کے علاوہ اور کوئی بیوقوف سے بیوقوف آدمی بھی بقائمیٔ ہوش وحواس ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ مرگی کے دوروں کا ہذیان، درحقیقت اسی قسم کی ہذیانی بکواس کا نام ہے جو ان یہودی اور عیسائی مستشرقین اور ان کے چیلوں کے زبان وقلم سے اسلام دشمنی کی ’’مرگی‘‘ کے دورہ میں نکل رہے ہیں۔